کلامی مسائل میں مولانا مودودیؒ کا مسلک

ڈاکٹر عبدالحق انصاری

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمتہ اللہ نے موجودہ دور میں اسلامی فکر کے احیا کے لیے جو تحریری کام کیا ہے اور اسلامی نظام زندگی کے قیام کے لیے جو تحریک چلائی ہے' دونوں ہی میدانوں میں ان کا کام اس صدی کا تجدیدی کام ہے اور مولانا کا شمار بجا طور پر مجددین امت کی فہرست میں کیا جائے گا۔ بعض امور میں مولانا' امام غزالیؒ' ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہؒ کی صف میں شانہ بشانہ کھڑے نظر آتے ہیں' بعض امور میں ان سے پیچھے اور بعض میں ان سے آگے۔

ان بزرگوں کی ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے پورے دین کا ایک انتہائی مربوط اور جامع تصور پیش کیا۔ امام غزالیؒ کی "احیاء علوم الدین" اور شاہ ولی اللہؒ کی "حجۃ اللہ البالغہ" اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ علامہ ابن تیمیہؒ کی تصانیف میں کوئی کتاب ایسی نہیں جو "احیاء العلوم" اور "حجۃ اللہ البالغہ" کے طریقے پر ایک جامع تصنیف کہی جائے لیکن دین کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہو جس پر انھوں نے قلم نہ اٹھایا ہو اور اس پر سیر حاصل بحث نہ کی ہو۔ ان کی تصانیف کا سرسری مطالعہ کرنے والا بھی یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ امام کے سامنے پورے دین کا واضح تصور تھا اور وہ اسی کے احیا کے لیے کوشاں تھے۔ یہی حال مولانا مودودیؒ کا ہے۔ ان کی کتابوں میں بھی کوئی ایک کتاب "احیاء العلوم" یا "حجۃ اللہ البالغہ" جیسی نہیں ہے لیکن انھوں نے بھی دین کے ہر پہلو پر لکھا اور پورے دین کا جامع نقشہ انتہائی مرتب طریقے پر پیش کیا اور اسی کی اقامت کے لیے تحریک چلائی۔

جن پہلوؤں میں مولانا کا کام ان بزرگوں کے کام کے مقابلے میں فروتر ہے' وہ اسلام کے بنیادی تصورات کی تشریح اور ان کے مقابل نظریات کی تنقید اور تردید ہے۔ اس میدان میں ان بزرگوں کے کام میں جو فلسفیانہ گہرائی اور تجزیہ و تحلیل ہے' مولانا کے یہاں وہ نہیں ملتی۔ مثال کے طور پر امام غزالیؒ نے "تہافتہ الفلاسفہ" میں اپنے دور کے فلسفیانہ نظریات پر جس طرح کی تنقید کی ہے' یا "اقتصاد فی الاعتقاد" میں اسلامی عقائد کی جس ڈھنگ سے تشریح کی ہے یا ابن تیمیہؒ نے "درء تعارض العقل والنقل" اور

"منہاج السنتہ" میں مخالف منطقی فلسفیانہ اور کلامی نظریات پر جو تنقید کی ہے اور شاہ ولیؒ اللہ نے "خیر کثیر" اور "بدور بازغہ" میں اسلامی تصورات کی عمارت جن بنیادوں پر اٹھائی ہے، ایسی کوشش مولانا کے یہاں نہیں ملے گی۔

مگر مولانا نے بعض دوسرے میدانوں میں ان بزرگوں سے زیادہ وقیع خدمات انجام دی ہیں، مثلاً اسلام کی اجتماعی فکر کی جیسی تشکیل مولانا نے کی ہے، اسلام کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام کو جس تفصیل سے پیش کیا ہے اور اس کے دفاع اور تائید میں جو دلائل فراہم کیے ہیں اور ان کے مقابل مغربی افکار و نظریات، قدروں اور نظاموں پر جو تنقید کی ہے، وہ آپ اپنی مثال ہے۔

ایک دوسرا میدان، قرآن مجید کی تفسیر کا ہے۔ امام غزالیؒ کے ہاں اس میدان میں کوئی کام نہیں۔ اس سلسلے میں ان کی کتاب "المقصد الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی" کا ذکر کیا جا سکتا ہے لیکن وہ صرف اسماء الہیہ کی تشریح ہے۔ امام ابن تیمیہؒ نے سورہ اخلاص اور مختلف سورتوں اور آیتوں کی تفسیر کی ہے جس کا مجموعہ "تفسیر ابن تیمیہ" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے لیکن امام موصوف کی کوئی مستقل تصنیف تفسیر میں نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے اصول تفسیر میں "الفوز الکبیر" لکھی اور "الفتح المنیر" مرتب کی اور قرآن مجید کا ترجمہ کیا ہے۔ مولانا مودودیؒ کی "تفہیم القرآن" تفسیر میں ایک عظیم کاوش ہے۔ ایک نئے انداز سے قرآن مجید کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش ہے۔ موجودہ دور میں انسانی زندگی کے مختلف علمی اور عملی مسائل میں قرآن مجید کی رہنمائی کی وضاحت اور قرآن مجید سے متعلق سوالات جو آج ذہن میں اٹھتے ہیں اور مختلف اعتراضات جو مستشرقین نے اٹھائے ہیں، ان سب کا تشفی بخش جواب دینے میں مولانا کی یہ کوشش منفرد اور بے مثال ہے۔

مولانا کا تیسرا کام جس کی تفصیل و توضیح ان بزرگوں کے یہاں نہیں ملتی، وہ وحی و نبوت کے تصورات کی وضاحت اور انبیا و رسل کے مشن کی تفسیر و تقریر ہے، بالخصوص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تاریخ ساز کارناموں کا تعارف، اسلامی قانون و شریعت میں سنت کے مقام کی وضاحت اور حدیث کی قدر و قیمت گھٹانے یا اس کی تضعیف و انکار کی کوششوں کی تنقید و تردید۔

مولانا کا چوتھا کام اسلامی نظام زندگی کی دعوت، شہادت اور اقامت کے لیے ایک تحریک کا برپا کرنا ہے۔ اس میدان میں وہ ان تمام بزرگوں سے آگے نظر آتے ہیں۔ امام غزالیؒ کے کام سے متاثر ہو کر ان کے ایک شاگرد ابن تومرت نے شمالی افریقہ میں تحریک شروع کی لیکن خود امام نے کوئی تحریک نہیں اٹھائی۔ امام ابن تیمیہؒ نے بذات خود حکومت اسلامیہ کے دفاع میں جہاد کیا اور چند ساتھیوں کے ساتھ امر بالمعروف کے فریضے کو ادا کرنے کی کوشش کی لیکن انھوں نے کوئی اسلامی تحریک منظم نہیں کی۔ یہی حال حضرت شاہ ولیؒ اللہ کا

ہے۔ شاہ صاحب کی احیاے دین کی علمی کوششوں سے متاثر ہو کر آپ کے خانوادے اور معتقدین کے درمیان سے افراد اٹھے اور انھوں نے اسلامی تحریک چلائی مگر خود شاہ صاحب اس میدان میں نہیں اترے۔ (اسلامی تحریک چلانے اور اسے منظم کرنے کی) یہ سعادت صرف مولانا مودودیؒ کے حصے میں آئی۔

آیندہ سطور میں بڑے اختصار کے ساتھ مولانا مودودیؒ کے تجدیدی کام کے صرف ایک پہلو کا ذکر کیا جائے گا۔ کلامی مسائل کی تقریر میں جو نیا اسلوب مولانا نے اختیار کیا ہے، اس کا مختصر تعارف چند مثالوں کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔

مولانا مودودیؒ سے پہلے اسلامی عقائد کی تشریح اور دفاع کا کام ہندستان میں پہلے سے ہوتا رہا، جس میں ایک ممتاز نام، علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی (م ۱۰۶۶ھ / ۱۶۵۶ء) کا ہے۔ مولانا مودودیؒ کے دور یا ان سے کچھ ہی پہلے علامہ شبلیؒ نعمانی کی "علم الکلام" اپنے موضوع پر ایک قابل قدر اور مفید تصنیف ہے۔ مگر اس میں علم کلام کے قدیم سرمایے ہی سے استفادہ کیا گیا ہے۔ کوئی نئی بات یا نیا اسلوب و استدلال یا نئی معلومات اس میں نہیں ملتیں۔ ڈاکٹر محمد اقبال کی کتاب: Reconstruction of Religious Thought in Islam تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ یقیناً مولد اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے ایک نئی اور منفرد کوشش ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب کی اس فلسفیانہ کاوش سے کماحقہ استفادہ فلسفے کے طلبہ اور وسیع العلم حضرات ہی کر سکتے ہیں۔

مولانا مودودیؒ نے اسلامی عقائد اور بنیادی نظریات کی تشریح میں عام انسانوں کو پیش نظر رکھا ہے، ان کا انداز فلسفیانہ نہیں، کلامی ہے۔ مگر وہ کلامی مباحث میں ایک نئے اسلوب اور طریقے کے موجد ہیں، جو اس اسلوب سے بہت مختلف ہے جو کلام کی مشہور اور معروف کتابوں میں اختیار کیا گیا ہے۔ مولانا نے ۱۹۴۱ میں جماعت اسلامی کی تشکیل کے وقت امیر جماعت منتخب ہونے کے بعد خطبہ دیتے ہوئے کہا: "کلامی اور فقہی مسائل میں میرا اپنا ایک طریقہ ہے۔ جماعت اسلامی میری ان رایوں کی پابند نہیں ہے" (روداد جماعت اسلامی حصہ اول، ص ۳۴)۔ یہ بات کہ مولانا کا کلامی مسائل میں اپنا ایک طریقہ اور مسلک ہے، مولانا نے یوں ہی نہیں کہہ دی اور نہ مولانا اس طرح کی باتیں کرنے کے عادی تھے۔ مولانا کے کلامی اسلوب اور طریقہ استدلال کو کلامی فکر کی تاریخ کے پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو مولانا اپنے اس قول میں حق بجانب نظر آتے ہیں۔

مولانا کی کوئی مستقل تصنیف کلام میں نہیں ہے لیکن انھوں نے مختلف کلامی مسائل پر قلم اٹھایا ہے، مقالے اور رسالے لکھے ہیں۔ بعض کتابوں میں کلامی موضوعات پر ان کے مباحث کئی صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ خدا کا وجود، اس کی ذات و صفات، توحید اور شرک، وحی و نبوت، اور نبوت محمدی علیہ الصلوٰۃ والسلام، ختم نبوت، جبر و قدر، عدل و جور، حسن و قبح، زندگی اور موت، وسیلہ اور توسل وغیرہ مختلف مسائل پر مولانا

نے لکھا ہے۔ اس مختصر سے مقالے میں مولانا کے تمام کلامی آرا سے تعرض کیا، ان کا ذکر بھی آسان نہیں ہے۔ کوشش صرف اس بات کی ہو گی کہ چند بنیادی امور میں مولانا نے جو طریقہ استدلال اختیار کیا ہے اس کو واضح کر کے اس کی اہمیت اجاگر کر دی جائے۔

علم کلام کی پرانی معروف کتابیں جس علمی اور سماجی پس منظر میں لکھی گئیں، اس سے وہ پس منظر بہت مختلف ہے جس میں مولانا مودودیؒ نے کلام کیا ہے۔ پرانا علم کلام اس مفروضے پر قائم ہے کہ ماورائی حقیقتوں کے بارے میں بھی عقل کی بنیاد پر کسی حتمی رائے پر پہنچا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علم کلام کی امہات کتب کی ابتدا میں علم کی بحث پڑھ کر یہ احساس ابھرتا ہے کہ مصنف کے نزدیک، خدا، کائنات، انسان، وحی و نبوت، زندگی بعد موت وغیرہ کے حقائق کے بارے میں عقل کی بنیاد پر قطعی دلائل دیے جا سکتے ہیں۔ امام غزالی نے "تھافتہ الفلاسفہ" میں مابعد الطبیعیاتی امور اور بعض طبیعاتی امور میں فلاسفہ کے نظریات پر تفصیل سے تنقید کی ہے، جن امور میں ان کے نظریات اسلامی عقائد سے مختلف ہیں، مثلاً عالم کے قدیم اور ابدی ہونے کا نظریہ تو ان نظریات کی تردید کی ہے اور جن امور میں اسلامی تصورات سے ان کا اتفاق ہے، امام نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فلاسفہ ان کا اثبات کرنے سے عاجز ہیں۔ امام کی اس کتاب کا ایک اہم نتیجہ یہ تھا کہ مابعد الطبیعیاتی امور میں خالص عقلی بنیادوں پر کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ انسانی عقل ان مسائل میں امکان اور اغلبیت کے اثبات سے آگے نہیں جا سکتی اور یقین عطا نہیں کر سکتی۔ یہ بات امام نے اپنی کتاب "المنقذ من الضلال" میں صاف طور پر کہی ہے۔ لیکن لگتا ہے کہ امام نے خود اس بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ ان کی "الاقتصاد فی الاعتقاد" اور دوسری تصنیفات کو پڑھ کر یہ تاثر نہیں ہوتا کہ ان کا مصنف "تھافت" اور "المنقذ" کا لکھنے والا ہے۔ امام موصوف کے بعد لکھی جانے والی کلام کی ممتاز اور مشہور کتابوں میں بھی اس خیال کا کوئی اثر نہیں ملتا۔

مولانا مودودیؒ کا کلامی فکر جس دور میں پروان چڑھا ہے اس میں ایک بنیادی تبدیلی آ گئی تھی۔ جرمن فلسفی، کانٹ (م: ۱۸۰۴) کی تصانیف بالخصوص (Critique of Pure Reason)، "عقل محض کی تنقید" کے بعد سے مغربی فلسفے میں یہ نظریہ عام ہو گیا کہ مابعد الطبیعیاتی امور میں صرف عقل کی بنیاد پر کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی، اور کوئی مضبوط عمارت کھڑی نہیں کی جا سکتی۔ فلسفے کی دنیا میں ایک اور بڑی تبدیلی امریکہ کے ان فلسفیوں کے ذریعے آئی جنھوں نے Pragmatism کا نظریہ پیش کیا، جس کی رو سے نظریات کے قبول و رد میں یہ بات سب سے زیادہ اہم ہے کہ ان سے کون سے عملی مسائل حل ہوتے ہیں اور ان کے اثرات زندگی پر کیسے مرتب ہوتے ہیں۔

مولانا کے کلامی تفکر میں ان دونوں تبدیلیوں کا اثر ہے۔ پہلی کے زیر اثر مولانا یہ موقف اختیار نہیں

کرتے، جیسا کہ قدیم متکلمین کرتے ہیں، کہ وہ مابعد الطبیعیاتی امور میں حتمی اور قطعی دلائل مہیا کر سکیں گے اور بڑی صفائی سے کہتے ہیں کہ ان معاملات میں ایمان ہی ہوتا ہے، علم قطعی نہیں۔ لگتا ہے کہ مولانا کو اس بات پر یقین قرآن مجید کے مطالعے سے حاصل ہوا۔ جس کے شروع ہی میں کہا گیا ہے: "یہ کتاب ان پرہیزگار لوگوں کے لیے ہدایت ہے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں" (البقرہ ۲:۲)۔

مولانا مابعد الطبیعیاتی امور میں اپنے قاری کو علم قطعی تک پہنچانے کا دعویٰ نہیں کرتے۔ وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ ان امور میں انسان کے سامنے جو متبادل نظریات رکھے گئے ہیں یا پیش کیے جا سکتے ہیں ان میں اسلام کا نظریہ سب سے زیادہ معقول ہے۔ اس کے خلاف کوئی عقلی دلیل نہیں، اس کے مقدمات عقلی اصولوں کے مطابق ہیں، فطرت انسانی کے تقاضوں اور داعیات سے موافقت رکھتے ہیں اور ان کی بنیاد پر جو عملی رویہ مرتب ہوتا ہے، جس طرح کی زندگی تشکیل پاتی ہے اور جو سماج بنتا ہے، وہ اس عملی رویے، زندگی اور سماج سے بدرجہا بہتر ہے جو دوسرے نظریات کی بنیاد پر تعمیر پاتے ہیں۔ مولانا کی تقریر کا حاصل یہ ہے کہ اگرچہ ان امور میں "ایمان" (faith) سے مفر نہیں لیکن یہ ایمان عقل کے خلاف نہیں بلکہ عقل اور فطرت انسانی کے عین تقاضوں کے مطابق ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایمان دو طرح کا ہو سکتا ہے: ایک عقلی (rational) اور دوسرا جس میں عقل کے خلاف مختلف چیزیں ہوتی ہیں اور جو مختلف درجے میں غیر معقول (irrational) ہوتا ہے۔ ان امور میں جس چیز کی طلب انسان کو کرنی چاہیے وہ علم قطعی نہیں، معقول ایمان (rational faith) ہے جو حیات بخش اور زندگی ساز ہو۔

مولانا نے یہ بات بڑی شد و مد سے رکھی ہے کہ عقلیت کے جو دعوے دار صرف علم چاہتے ہیں اور ایمان کی تحقیر کرنا چاہتے ہیں، انھیں یہ احساس نہیں ہے کہ انسانی زندگی، فرد کی ہو یا معاشرے کی، اس میں علم کا کم اور ایمان کا دخل زیادہ ہے۔ ہم کن ماں باپ کی اولاد ہیں، ہمارے آبا و اجداد کون تھے، ہماری تاریخ اور روایات کیا ہیں، ہماری قومی زندگی کس طرح تشکیل پاتی ہے اور ان کی بنیادیں کن چیزوں پر استوار ہوئی ہیں، ان کا کتنا حصہ علم قطعی پر مبنی ہے اور کتنا ایمان پر؟ اسی طرح ہماری روز مرہ کی زندگی جس طرح کی معلومات پر قائم ہے، جس طرح کی خبریں، اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور دوسرے ذرائع ابلاغ سے ملتی ہیں اور ہماری زندگی کو ڈھالتی رہتی ہیں، ان میں کتنا حصہ ایسا ہے جسے علم کہا جائے گا اور کتنا حصہ ایسا ہے جس کو ایمان اور اعتماد کہا جائے گا؟ مولانا کہتے ہیں کہ اگر آپ بنظر غائر اس مسئلے کی تحقیق کریں تو آپ کو پتا چلے گا کہ ہماری زندگی میں علم کا دخل کم اور ایمان کا دخل کہیں زیادہ ہے۔

خدا کے وجود کے بارے میں متکلمین نے جو دلیل عام طور پر دی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں وہ مختلف اجزا سے مرکب ہیں، ان اجزا میں ترکیب خود ان اشیا کے اجزا کے اندر سے نہیں آ

سکتی، اس لیے لازم ہے کہ خارج سے آئے اور وہ ذریعہ صرف خدا کی ذات ہے۔ یہ دلیل بڑے شرح و بسط اور منطقی ترتیب کے ساتھ امام الحرمین کی "کتاب الارشاد"، شہرستانی کی "نہایتہ الاقدام"، عبدالقاہر کی اصول الدین، امام رازی کی "اربعین" اور ایجی کی "المواقف" میں بیان ہوئی ہے۔ اگرچہ ان کتابوں میں اور دوسرے دلائل بھی دیے گئے ہیں جو جوہر اور عرض، امکان و حدوث وغیرہ تصورات سے شروع ہوتے ہیں۔

قرآن مجید نے خدا کے وجود کے سلسلے میں جو دلیل دی ہے متکلمین کی دلیل ترکیب اس کا ایک جز ہے۔ اس دلیل سے صرف ایک مرکب یا ترکیب دینے والے کا وجود ثابت ہوتا ہے مگر قرآن مجید کی دلیل صرف اشیا کی اندرونی ترکیب اور ساخت کے پیش نظر نہیں ہے بلکہ ان کے عمل و حرکت، ان کی غایت و مقصد، اور دوسری اشیا کے ساتھ ان کے تعلق و تعامل، تاثیر اور تاثر، سب کو پیش نظر رکھتی ہے۔ قرآن کی دلیل سے صرف ایک مرکب ہی نہیں خالق کا وجود ثابت ہوتا ہے۔

امام ابن تیمیہؒ نے دلیل ترکیب پر مفصل تبصرہ کیا ہے اور قرآن مجید کی دلیل خلق کو بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اسی طرح مولانا مودودیؒ نے بھی قرآن مجید کی دلیل کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اپنے مضمون "عقل کا فیصلہ" میں انھوں نے ایک اور طریقہ اختیار کیا ہے۔ یہاں انھوں نے کائنات کے وجود کے بارے میں مختلف نظریات گنائے ہیں، مثلاً یہ کہ کائنات خود سے وجود میں آگئی، یا جن مادوں سے اس کی مختلف چیزیں بنیں، ان میں ترکیب انھی کے اندر سے پیدا ہوگئی، یا یہ کہ اس کے مختلف اجزا کو مختلف روحوں اور دیوتاؤں نے وجود بخشا، ان مختلف نظریات کے قائلین کے بالمقابل کچھ افراد ابتدائے آفرینش سے ایسے بھی پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ ان کے پاس علم کا ایک ذریعہ ہے جو دوسروں کے پاس نہیں، ان بزرگوں نے خواہ وہ کسی قوم میں اور کسی زمانے میں پیدا ہوئے ہوں، ایک ہی دعویٰ کیا کہ وہ اور خود یہ پوری کائنات ایک ہی خالق کی پیدا کردہ ہیں۔ وہی اس کا مدبر اور مالک ہے اور اسی کا قانون اس کائنات میں چل رہا ہے۔ پھر یہ لوگ نہ دیوانے تھے اور نہ کم عقل، نہ جھوٹے اور نہ دھوکے باز، برعکس اس کے وہ عقل و فکر، عزم و ارادہ، سیرت و اخلاق سب پہلوؤں سے اپنے زمانے کے تمام دوسرے افراد سے فائق و ممتاز تھے۔ مولانا نے ان انبیا کے نظریے کو دوسرے تمام نظریات کے مقابلے میں رکھ کر اس کی برتری ثابت کی ہے، اور اس طرح خدا کے وجود اور اس کی توحید کا اثبات کیا ہے۔

عام طور پر کلام کی کتابوں میں رسالت کی جو بحث ہوتی ہے اس میں وحی و نبوت کی ضرورت و بحث یا تو نہیں ہوتی یا بہت مختصر ہوتی ہے اور نبی و رسول کی پہچان پر تفصیل سے کلام ہوتا ہے۔ لیکن یہ کلام بعض وجوہ سے معجزے کے گرد گھومتا رہتا ہے جس کے ضمن میں معجزہ اور کرامت کے فرق، یا معجزہ اور سحر کے فرق کی بحث آتی ہے۔ نبی کی شناخت کو اس کے معجزات کے ساتھ وابستہ کرنے کی وجہ غالباً یہ رہی ہے کہ

کلام کی اکثر معروف و مشہور شخصیتیں اشعری فکر کی حامل رہی ہیں جن کے نزدیک حسن و قبح، خیر و شر میں امتیاز کے لیے عقلی بنیادیں نہیں ہوتیں۔ اس لیے نبی کی پہچان میں بھی عقل کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے ان بزرگوں کے لیے اس کی پہچان کی ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے یعنی معجزہ۔

مولانا مودودیؒ تحسین و تقبیح کے معاملے میں اشعری نہیں ہیں، مولانا سے پہلے ابن تیمیہؒ بھی اس معاملے میں اشاعرہ سے اختلاف رکھتے تھے، اس لیے انھوں نے اور مولانا دونوں نے نبی کی صداقت جاننے کے لیے نبی کی تعلیمات کی معقولیت، اس کی سیرت و اخلاق کی بلندی، اس کی سچائی اور صداقت، اس کی بے لوثی اور قربانی، اس کی تعلیمات کی حیات ساز قوت اور قوموں کی زندگی کی تعمیر میں ان کے کردار اور کارناموں کو نمایاں کیا ہے۔ مولانا کا مقالہ "نبوت محمدی کا عقلی ثبوت" اس طریقہ استدلال کی ایک نمایاں مثال ہے۔

مولانا کے اسلوب کی سب سے درخشاں مثال ان کا منفرد رسالہ "زندگی بعد موت" ہے۔ مولانا کے استدلال کا خلاصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

موت کے بعد کوئی زندگی ہو گی یا نہیں اور اگر ہو گی تو کیسی ہو گی، اس سوال کا جواب سائنسی ذرائع سے کام لے کر نہیں دیا جا سکتا، سائنس کی بنیاد پر اس زندگی کا اثبات کیا جا سکتا ہے اور نہ انکار۔ لیکن یہ سوال صرف ایک علمی سوال نہیں جس کا زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اس لیے اس کے بارے میں سکوت اور غیر جانب داری کا رویہ اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے امور میں سکوت کے معنی بھی انکار ہی کے ہوں گے۔ اس لیے ہر انسان کو موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں کوئی نہ کوئی فیصلہ لازماً کرنا ہو گا۔

موت کے بعد کی زندگی کی ضرورت کا احساس تھوڑے سے غور و فکر سے ہو جاتا ہے۔ اس دنیا میں ہم جو کام کرتے ہیں اس کے کچھ طبعی نتائج ہوتے ہیں اور کچھ اخلاقی۔ طبعی نتائج کے وقوع میں دیر نہیں لگتی مگر اخلاقی نتائج کا وقوع لازمی اور یقینی نہیں ہوتا۔ آپ اگر کسی بے گناہ شخص پر گولی چلائیں گے تو اس کی موت واقع ہو جائے گی، لیکن اس جرم کا اخلاقی نتیجہ یعنی یہ کہ آپ کو سزا ملے اس بات پر منحصر ہے کہ آپ کے خلاف مقدمہ ہو، عدالت میں آپ کا جرم ثابت ہو اور آپ کو سزا دی جائے۔ پھر اگر سزا بھی آپ کو ہو جائے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ اس جرم کے متوازی ہو جو آپ نے کیا اور اکثر یہی ہوتا ہے کہ جرم کی یا تو کوئی سزا نہیں ہوتی یا اس کے برابر نہیں ہوتی۔ ایک آدمی پورے کنبے کو ہلاک کر دیتا ہے، اگر اس کو موت کی سزا بھی دی جائے تو وہ بھی تمام کنبے کے ہلاک کرنے کے جرم کے برابر نہیں ہو گی۔ اس کے برعکس بہت سے نیک افراد نیکی کرتے کرتے دم توڑ دیتے ہیں اور انھیں اس کا کچھ بھی صلہ نہیں ملتا۔

اگر غور کیا جائے تو پتا چلے گا کہ یہ دنیا اخلاقی جزا و سزا کے لیے بنائی ہی نہیں گئی۔ اس کا نظام اور انسانی زندگی کی موجودہ ہیئت ایسی نہیں کہ انسان اپنے نیک کاموں کا پورا اجر پا سکے یا اپنے مظالم کی پوری سزا بھگت

سکے۔

اگر عقل کا تقاضا، انسان کی فطرت کی پکار اور انسانی سماج کی بنیاد اس اصول پر قائم ہے کہ انسانوں کو اپنی بھلائی کی جزا پوری پوری ملے اور اپنی برائیوں کی سزا بھی پوری بھگتنی پڑے تو پھر ضروری ہے کہ موت کے بعد ایک ایسی زندگی ہو جہاں دنیا کا یہ نظام نہیں دوسرا نظام ہو جہاں انسان کی زندگی کی ساخت ایسی تبدیل کر دی جائے کہ مکافات کا عمل مکمل ہو سکے۔

مولانا نے لکھا ہے کہ یہاں تک عقل انسان کو پہنچا دیتی ہے۔ وہ یہ بتا دیتی ہے کہ موت کے بعد ایک زندگی آنی چاہیے تاکہ اس میں انسان کے اعمال کی جزا و سزا پوری طرح مرتب ہو سکے۔ لیکن کیا ایسا ہی واقعتاً ہے۔ یہ بات ہمیں انبیا کے بیان سے معلوم ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ آخرت کا وقوع اور اس کی جزا سزا ہمارے لیے صرف ایک امکان اور ایک ضرورت ہی نہیں ہے، ہمیں تو اس حقیقت کا مشاہدہ بھی کرا دیا گیا ہے، ہم اپنے علم و مشاہدے کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ آخرت ہے اور اس زندگی میں ہمارے اعمال ہمارے سامنے پیش کیے جائیں گے اور ان پر ہمارا خالق اور مالک ہمیں پوری پوری جزا اور سزا دے گا۔

یہ استدلال ان دلائل کا نچوڑ ہے جو قرآن مجید نے آخرت کی ضرورت کے بارے میں دیے ہیں۔ اس کی ترتیب میں عقل کے حدود اور تقاضوں کو وہ مقام دیا گیا ہے جو ان کا ہے اور ایمان کو بھی وہ جگہ دی گئی ہے جو اسے حاصل ہے۔

(یہ مقالہ انجمن طلبہ قدیم جامعتہ الفلاح بلیریا گنج، اعظم گڑھ یوپی کے زیر اہتمام ۲۶ر اکتوبر ۹۶ کو منعقد ہونے والے ایک سیمینار کے لیے لکھا گیا)